خواجہ حسن ثانی نظامی

تصوف اور انسان دوستی

حضرت زکریا ملتانیؒ نے ایک دفعہ شیخ شیوخ العالم بابا فرید گنج شکرؒ کو شاید بے خیالی میں یہ لکھ دیا کہ ہم میں تم میں "عشق بازی" ہے۔ بابا صاحب نے اپنے بے تکلف دوست کو فوراً ٹوکا اور لکھا کہ ہم میں آپ میں صرف "عشق" ہے "بازی" نہیں ہے!

سچ تو یہ ہے کہ تصوف نے "عشق" کو بازی سے الگ کیا۔ دکھاوے سے الگ کیا اور شرک سے بھی الگ کیا۔ یہ تینوں چیزیں عشق کے لیے کلنک کا حکم رکھتی ہیں۔ عشق اور شرک کا تو ازل سے بیر ہے۔ شرک محبت کو تقسیم کرتا ہے' خانوں میں بانٹتا ہے' ہرجائی بناتا ہے۔ کمزور' بے جان اور بے اثر کر دینا چاہتا ہے۔ توحید' محبت کو سمیٹتی ہے' یکسوئی بخشتی ہے۔ قطرے کو دریا بناتی ہے' جوش و قوت عطا کرتی ہے' عشق کا سکہ' توحید ہی کے بل پر دنیا میں چلتا ہے۔

عشق' صرف ایک ذات کو تمام توجہات کا مرکز بناتا ہے۔ احساس دلاتا ہے کہ بس وہی ایک ذات' ہر شے کو محیط ہے۔ ہر روپ اس کا روپ ہے۔ ہر شان اس کی شان ہے۔ جو کچھ دیکھو' اس سے دیکھو۔ اس میں دیکھو' اور اس کی تلاش خود اس کے کارخانہ قدرت میں دیکھو۔

یہ تصوف ہی کا فیض تھا کہ ٹیگور' گوتم بدھ کے گھر چھوڑنے کا نقشا کھینچے بیٹھے اور انہوں نے دکھایا کہ گوتم' بال بچوں پر حسرت کی نگاہ ڈال کر رخصت ہو رہے ہیں تو اس وقت ایک غیبی آواز انہیں یہ کہتی سنائی دی کہ "

میرا بندہ مجھے چھوڑ کر میری تلاش میں کہاں جا رہا ہے؟"

صوفیہ' عالم کو معدوم یا فریب نظر نہیں مانتے' بلکہ ان کے نزدیک عالم اور انسان' عین حق یا مظہر حق ہے۔ قرآن کا فرمان بھی یہی ہے کہ موجودات' خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں' زمانی ہوں یا مکانی' سب کی حقیقت اللہ ہی ہے۔

هو الاول و الاخر و الظاهر و الباطن

لا الہ الا اللہ کا مطلب' صوفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے' نہ مقصود ہے اور نہ موجود!

اللہ نور السموات و الارض ہے۔ اور نور کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ النور هو الظهور و الظهور هو الموجود۔ نور کے معنی ظہور ہیں اور ظہور اور وجود ایک ہے۔

صوفیہ نے انسان کو ہمیشہ اپنی وحدت وجودی عینک سے دیکھا۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے حضرت خواجہ شمس الدین یحییٰ کو جو خلافت نامہ دیا تھا' اس میں تلقین کی بنیاد اس حدیث شریف کو بنایا تھا:

و الذی نفس محمد بیده لئن شئتم لا قسم لکم ان احب عباد اللّٰه الی اللّٰه الذین یحبون اللّٰه الی عباد اللّٰه و یحبون عباد اللّٰه الی اللّٰه۔

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی جان ہے' اگر تم چاہو تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ بندگان خدا میں سب سے زیادہ خدا کے دوست وہ لوگ ہیں جو خدا کو دوست رکھتے ہیں' اس کے بندوں کی طرف اور بندگان خدا کو دوست رکھتے ہیں خدا کی طرف"۔

حضرت امیر خورد کرمانیؒ محبوب الٰہیؒ کی زبانی یہ حدیث شریف بھی نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں میں محض اللہ تعالیٰ کے لیے محبت ہو' ان میں سے ایک مشرق میں رہتا ہوں' اور دوسرا مغرب میں' تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان دونوں کو یک جا کرے گا اور فرمائے گا کہ تم دونوں کی یہ ملاقات اس محبت کی بنا پر ہے جو تم ایک دوسرے سے رکھتے تھے۔ اب تم ملاقات کرو کہ تمہاری یہ محبت ہماری وجہ سے تھی۔

صوفیہ نے انسان کو کبھی حقیر اور غیر نہ جانا۔ ان کے سرگردہ حضرت مولانا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے:

> "اے انسان تو اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے؟ حالانکہ تجھ میں سب سے بڑا عالم پوشیدہ ہے' تو ہی وہ کتاب مبین ہے' جس کے حروف سے اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ تو ہی عین وجود ہے' اور جو کچھ تجھ میں ہے' اس کا حصر نہیں کیا جاسکتا!"

تعلیمات تصوف کے زیر اثر آدمی سے آدمی کی دوستی محض اس وجہ سے نہیں رہی کہ وہ ماں ہے' باپ ہے' بھائی ہے' بہن ہے' بیوی ہے' یا ایک سارنگ روپ' رہن سہن رکھتا ہے بلکہ ایک نئی بنیاد اور سب سے بڑی بنیاد یہ نکل آئی کہ آدمی اللہ کی مخلوق ہے۔ ہم اللہ کو چاہنے والے ہیں۔ اللہ اپنی مخلوق کو چاہتا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی اس کی مخلوق کو چاہنا چاہیے' اور وہ جیسی بھی ہے ہر حال میں اس سے محبت لازم ہے۔

پیران سلسلہ اپنے مریدوں کو' جن کی مراد در اصل اللہ ہوتا ہے "یار" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں اور ایک پیر کے مرید آپس میں پیر بھائی کہلاتے ہیں' اور سگے بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

تصوف ایک زمانے تک "بے لفظ حقیقت" رہا ہے۔ ابتدا میں اس پر کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ اس کو فلسفہ بنا کر پیش نہیں کیا گیا' لیکن مسلمان اکابر

تصوف کو برتتے رہے۔ تصوف ان کے روزمرہ کے اشغال و اعمال کی روح بنا رہا۔ خانقاہیں، تصوف کی کتابوں سے پہلے وجود میں آگئی تھیں اور وہاں سے یہ "بے لفظ حقیقت" ساری دنیا میں پھیل رہی تھی۔ انسان کی اہمیت اور انسان دوستی کا پیغام بھی ان خانقاہوں سے اس طرح عام ہوا کہ فوری طور پر لوگ محسوس بھی نہ کر سکے کہ کوئی شعوری کوشش ان کو کسی خاص سمت میں لے جانے کی ہو رہی ہے۔ اپنی بات کہنے اور اپنی بات پہچاننے کے جو البیلے انداز اختیار کیے گئے، ان میں بانی سلسلہ عالیہ چشتیہ حضرت خواجہ ابو اسحاق شامیؒ کے پیرو مرشد حضرت علو دینوریؒ کی یہ ادا بھی تھی کہ وہ اپنی خانقاہ کا دروازہ بند رکھتے۔ کوئی اسے کھلواتا تو پوچھتے، بھائی! پہلے تو یہ بتا کہ مسافر ہے یا مقیم؟ اگر تو مسافر ہے تو کچھ دیر میرے ساتھ رہے گا اور میرا دل تجھ سے محبت کرنے لگے گا، اور تیری رخصت سے مجھے تکلیف ہوگی۔ مجھ میں فراق کی طاقت کہاں ہے؟ میری خانقاہ تو رہ پڑنے والوں کا ٹھکانہ ہے!

اور واقعی جو بھی ان خانقاہوں میں داخل ہوتا تھا، جذبہ محبت سے سرشار ہو کر رہ پڑنے کی سوچتا تھا۔ دور جا کر بھی اس کا دل وہیں رہتا تھا۔ یہ خانقاہیں دراصل دوست داری کا معبد تھیں۔

ابن تیمیہ نے مسجد کی موجودگی میں خانقاہ کی تعمیر کی مخالفت کی تھی اور اس کو بدعت قرار دیا تھا۔ عالم اسلام اگر اس مشورے کو قبول کر لیتا تو تبلیغی نقصان کے علاوہ لوگ اسلامی اخوت و محبت کی چاشنی سے بھی شاید ناواقف رہتے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کہا کرتے تھے کہ طاعت و عبادت کے لیے مسجد خوب ہے اور ظاہر و باطن کی مشغولی کے لیے خانقاہ! خانقاہ میں بیٹھنا ہمدردی اور دل داری کے لیے ہے۔

اور واقعی جو دل داریاں خانقاہوں میں ہو گئیں، وہ مسجد میں ممکن ہی نہ تھیں۔ نظامیہ سلسلے کے مجدد اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر بزرگ،

حضرت مولانا فکر الدین محب النبیؐ کی خدمت میں ایک شخص روزانہ آکر بیٹھا کرتا تھا اور اکثر نشے کی حالت میں ہوتا تھا۔ ایک روز آتے ہی قے کرنے لگا۔ حضرت نے اس کو سنبھالا تو سارے کپڑے ناپاک ہوگئے۔ حاضرین نے شکوہ کیا کہ آپ نے کبھی اس کو نشے کی حالت میں آنے سے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ نوبت یہ آگئی کہ آج آپ کے سارے کپڑے اس نے گندے کر دیے۔ مولانا فخر صاحبؒ نے جواب دیا۔ میں ابھی جا کر غسل کرلوں گا اور کپڑے بھی دھولوں گا'۔ پاک ہو جائیں گے۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا تو یہ میری باتیں کیسے سنتا' اور اس کا دل بھی ٹوٹ جاتا۔ ٹوٹے دل کو جوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے! حضرت کے اس برتاؤ نے وہ کام کیا جو ہزار وعظ و نصیحت اور فتوے نہ کرسکتے تھے۔ ہوش میں آتے ہی شرابی کو اپنی حرکت پر اس قدر ندامت ہوئی کہ ہمیشہ کے لیے شراب سے توبہ کرلی۔

قرآن نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ:

"ولوکنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک (آل عمران)

"اور (اے محمدؐ) اگر آپ درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے چل دیتے۔"

صوفیہ نے اس قرآنی نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا اور اخلاق محمدیؐ سے اپنے آپ کو اس طرح آراستہ کیا تھا کہ وہ رحمت رحمۃ للعالمین" کے القاب سے یاد کیے جانے لگے تھے' اور ہر شخص بے جھجک ان کے پاس آتا جاتا تھا' اور اپنے دکھ درد کی دوا ڈھونڈتا تھا۔ ہندستان کی ابتدائی مسلمان حکومتوں کے دور میں' جبکہ غیر مسلم رعیت اور مسلمانوں کے درمیان بڑی اجنبیت تھی' صوفیہ کے طرز عمل نے غیریت کے سارے پردے اٹھا دیے اور ہندو عوام ہی نہیں' جوگی اور ودوان بھی بے جھجک خانقاہوں میں آنے جانے

لگے اور ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے مذہب سے واقفیت حاصل کی اور تصوف اور اپنشدوں کی مشترکہ قدروں نے میل ملاپ بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ میں ایک دفعہ کوئی ہندو جوگی آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اس سے پوچھا:

"شما کدام راہ می روید؟ اصل کار در میان شما چیست؟ او گفت کہ در علم ما ہم چنیں آمدہ است کہ در نفس آدمی دو عالم است۔ یکی عالم علوی دوم عالم سفلی۔ از تارک تا ناف عالم علو یست و از ناف تا قدم عالم سفلی۔ سبیل کار آنست کہ در عالم علوی ہمہ صدق و صفا و اخلاق خوب و حسن معاملہ باشد و در عالم سفلی نگاہ داشت و پاکی و پارسائی۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بر لفظ مبارک راند کہ مرا ایں سخن او خوش آمد۔"

(آپ لوگ کس راہ جاتے ہیں' اور کام کی اصل آپ کے نزدیک کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہمارے علم میں یہ آیا ہے کہ آدمی کے نفس میں دو عالم ہیں۔ ایک عالم علوی دوسرے عالم سفلی۔ پریشانی سے ناف تک عالم علوی ہے اور ناف سے قدم تک عالم سفلی۔ کام کی بات یہ ہے کہ عالم علوی میں صدق و صفا اور اچھے اخلاق اور حسن معاملہ ہونے چاہیں' اور عالم سفلی میں نگاہ داشت پاکی اور پارسائی۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ مجھے اس کی یہ بات بہت اچھی لگی۔)

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کو ایک دفعہ کسی نے تحفے میں قینچی دی۔ حضرت نے یہ تحفہ واپس کر دیا اور فرمایا: "مجھے قینچی نہیں' سوئی دھاگہ دو۔

میں کاٹنے نہیں' جوڑنے آیا ہوں!"

انسان دوستی کی اہمیت' اہل تصوف کے نزدیک اتنی زیادہ تھی کہ وہ صرف اسی کو کافی نہیں سمجھتے تھے کہ کسی کو برا نہ کہا جائے' بلکہ یہ بھی ضروری جانتے تھے کہ کسی کا برا نہ چاہا جائے۔ حضرت محبوب الہیؒ کہا کرتے تھے کہ برا چاہنا' برا کہنے سے بھی زیادہ برا ہے۔ حضرت کا ایک مخالف مرگیا تو اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور دعا مانگتے ہوئے فرمایا کہ "اے اللہ یہ شخص مجھے برا کہتا تھا اور میرا برا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس کو معاف کر دیا۔ میری وجہ سے تو اسے سزا نہ دیجو۔"

حضرت کا فرمان تھا کہ غصہ پی جانا اچھی چیز ہے' لیکن اس سے بھی زیادہ اچھی چیز یہ ہے کہ معاف کر دیا جائے۔ کیونکہ محض غصہ پی جانے میں یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ شاید کینہ دل میں بیٹھ جائے۔

علما اور صوفیہ کی کش مکش ہر زمانے میں رہی ہے۔ دنیادار اور دربار دار علما کو "دانش مند" اور "دستار بند" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا' اور حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ فرماتے تھے کہ:

"درمیان دستار بندان دوستان خدا کم اند"

لیکن اس کے باوجود ایک ایسے ہی عالم' جو ہمیشہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کو ستاتے رہتے تھے' انتقال کر گئے تو حضرت نے فرمایا: "ایک ذات حامی شریعت تھی۔ افسوس وہ بھی نہ رہی۔"

ایک شخص نے شاید یہ سننے کی امید میں کہ آج کل علما' علماے حق نہیں ہیں' علماے سوء ہیں۔ حضرت محبوب الہی سے عرض کیا کہ حدیث نبویؐ "العلماء ورثۃ الانبیا" میں علما سے کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت نے فرمایا: "یہی علما' جنہیں تم دیکھتے ہو۔"

ارشاد ہوتا۔

ہر کہ ما را یار نبود ایزد او را یار باد
وا نکہ ما را رنجہ دارد، راحتش بسیار باد
ہر کہ او خاری نہد در راہ ما از دشمنی
ہر گلی کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

(ترجمہ) جو ہمارا دوست نہ ہو، اللہ اس کا دوست رہے۔ جو ہمیں رنج دے، وہ بہت راحت پائے۔ جو دشمنی سے ہمارے راستے میں کانٹا رکھے، اس کی زندگی کے باغ کا ہر پھول، بے کانٹے تر و تازہ رہے۔"

فرماتے، کہ اگر کوئی تمہارے راستے میں کانٹا رکھے، اور جواب میں تم بھی کانٹا رکھو، تو سب جگہ کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

نیز ارشاد ہوتا کہ طاعت کی دو قسمیں ہیں: طاعت لازم اور طاعت متعدی۔ طاعت لازم روزہ نماز وغیرہ ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ لیکن اس کا ثواب صرف طاعت کرنے والے کی ذات کو ہوتا ہے، اور طاعت متعدی ہر اس کام کو کہتے ہیں، جس میں بنی نوع انسان کا کوئی فائدہ ہو، اس کا ثواب بھی کچھ کم نہیں ہے۔

حضرت ہی کا فرمان ہے کہ دلوں کو راحت پہنچاؤ کہ مومن کا دل اسرار ربوبیت کی جگہ ہے اور قیامت کے دن، دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی مال کی طلب گاری نہ ہوگی۔

ایک بزرگ ساری دنیا کی سیاحت کر کے واپس آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ سفر میں کیا کیا عجائبات دیکھے؟ کہنے لگے: "ڈیڑھ آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ آدھا آدمی تو وہ تھا جو آسمان اور زمین کے بیچ خلا میں مصلا بچھائے نماز پڑھ رہا تھا اور پورا آدمی وہ تھا، جس کے پاس صرف ایک ہی روٹی تھی، اور وہ اس نے کسی اور بھوکے کو کھلا دی۔"

خانقاہوں میں لنگر خانوں کا قیام، انسان دوستی اور اسی تکمیل آدمیت

کے لیے عمل میں آیا تھا' جس کو سکھ گورو صاحبان نے بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ اختیار فرمالیا۔ اجمیر شریف میں آج بھی درگاہ شریف کی طرف سے جو لنگر ہوتا ہے' اس میں گوشت تو دور کی چیز ہے' کبھی لہسن پیاز کا استعمال بھی نہیں ہوتا کہ ہر عقیدے اور خیال کا آدمی بے تکلف کھانا کھالے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی شخص نے معرفت کا سبق چاہا۔ حضرت نے اس کے جواب میں اسے کھانا کھلا دیا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی اس کی درخواست پر کسی فلسفیانہ تقریر کے بجائے کھانا ہی سامنے رکھا جاتا رہا۔ آخر تنگ آکر اس نے شکایت کی اور کہا' شیخ! میں معرفت چاہتا ہوں' آپ کھانا کھلاتے ہیں! آخر آپ معرفت سکھانے میں بخل کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت نے مسکرا کر جواب دیا کہ میاں! معرفت یہی ہے کہ خدا کے بندوں کے سامنے کچھ رکھو' اور ان کی دل داری کرو!

حضرت بایزید بسطامیؒ اور دوسرے بزرگوں نے اس قسم کی جو باتیں فرمائیں ہیں' وہ سرسری باتیں اور لطیفے نہیں ہیں۔ ان میں بڑے پتے کی بات کہی گئی ہے۔ حق' خلق کے پردے میں پوشیدہ ہو' اور انسان کی نظر صرف خلق کو دیکھے' حق کو نہ دیکھے اور حق کو خلق کا غیر سمجھے' اس کو صوفیوں کی اصطلاح میں فرق کہتے ہیں' اور اس کے مقابلے میں جمع آتا ہے' یعنی سالک' حق کا مشاہدہ کرے اور خلق اس کی نظر سے غائب ہو جائے۔ اس طرح حق' خلق کا حجاب ہو جاتا ہے۔ یہ مرتبہ فنا کا ہے' جسے فنافی اللہ کہتے ہیں' اور خلق کو حق کے ساتھ اس طرح دیکھنا کہ حق کا مشاہدہ تمام موجودات میں ہو' اور یہ دیکھا جائے کہ حق ہر جگہ ایک علیحدہ صفت اور ایک الگ شان کے ساتھ ظاہر ہوا ہے' تو یہ جمع الجمع ہے۔ اور یہ مقام بقا باللہ کا ہے۔ اس سے بلند کوئی مقام نہیں ہے' کیونکہ اس میں جو شے ہے' جیسی ہے' ویسی ہی نظر آتی ہے۔ سالک' وحدت کو کثرت میں اور کثرت کو وحدت میں دیکھتا ہے' اس طرح کہ نہ خلق' حق کا

حجاب ہوتا ہے اور نہ حق، خلق کا حجاب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کشکول میں فرماتے ہیں کہ کمال یہ ہے کہ سرحد فنا فی اللہ پر پہنچ کر خدا کی بقا سے باقی ہو جائے۔ پہلی سیر (فنا فی اللہ) کو سیر الی اللہ اور دوسری سیر (بقا اللہ) کو سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ پہلی سیر کی انتہا ہے، دوسری سیر کی کوئی انتہا نہیں۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے اپنی مشہور کتاب عوارف المعارف میں تحریر فرمایا ہے کہ "انبیا کو علاحدہ کر کے واصلین کے دو گروہ ہیں۔ اول مشائخ صوفیہ، جنہوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پوری اتباع اور کامل تقلید سے وصول کا مرتبہ حاصل کیا ہے، اور اس کے بعد انہیں مخلوق کی ہدایت پر مامور کیا گیا ہے۔ یہ لوگ کامل اور مکمل کہلاتے ہیں کیونکہ وہ فضل و عنایت ازلی سے عین جمع و توحید کے دریا میں ڈوب جانے کے بعد تفرقے کے ساحل پر پہنچتے ہیں اور فنا کے بعد انہوں نے بقا حاصل کی ہے، تاکہ خلق کو نجات کا راستہ بتائیں اور بلند درجات تک پہنچائیں۔ دوسرا گروہ ان واصلین کا ہے جو واصل ہونے کے بعد اس عالم کی طرف لوٹ کر نہ آئے اور فنا فی اللہ اور بقا باللہ تک نہ پہنچے۔ مقام جمع میں اس طرح ڈوب گئے اور مستہلک ہو گئے کہ ان کی خبر ہی نہ آئی۔"

گویا انسان کا کمال یہ ہے کہ حق کو خلق میں دیکھے اور خلق کو حق میں۔ ایک کا مشاہدہ، دوسرے کے مشاہدے میں مانع نہ ہو۔ یہی مقام انسان کامل کا ہے جس نے خلافت الہیہ کا بوجھ اٹھایا ہے، جو طاعت لازم اور طاعت متعدی کا حق ادا کرتا ہے، جس کو معرفت حق اپنی عظمت سے واقف کراتی ہے اور تجلیات ربانی کا ظہور اسے اپنے آپ سے، انسان سے محبت کرنے کے آداب سکھاتا ہے۔ اس کا عشق، بازی سے، ریا کاری سے اور شرک سے پاک ہو کر اپنی معراج کو پہنچتا ہے۔ اس کے لیے کوئی غیر نہیں رہتا، کوئی پرایا محسوس نہیں

ہوتا۔ کوڑا کسی دوسرے کو لگتا ہے' تو نشان اس کے جسم پر ظاہر ہوتا ہے۔ کھانا دوسرے کھاتے ہیں' سیری اسے ہوتی ہے۔ آدمی کا دکھ اس کا دکھ' اور آدمی کا سکھ اس کا سکھ بن جاتا ہے۔ وہ دوستی کے اصلی معنی و مفہوم سے آگاہ ہوتا ہے' اور دوست کی جناب میں کوئی گستاخی' کوئی بے ادبی اسے گوارا نہیں ہوتی۔

سراپا خوبی و محبوبی' ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریہ ہند' پیر حسن شاہ کے مرید اور تربیت یافتہ تھے۔ شاہ صاحب ابتدائی زمانے میں ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے۔ شاید کسی ہندو کی دھوتی اور چوٹی کا مذاق اڑایا۔ ان کے پیر حضرت طالب حسین فرخ آبادیؒ کو بھی خبر ہوئی۔ کوئی اور ہوتا تو قرآن کا حکم " ولاتنا بزوابا لالقاب" ایک دوسرے کو برے ناموں سے نہ پکارو' سنا کر چپ ہو جاتا۔ مگر بحر توحید کا شناور جو کہتا ہے' وہ کرتا بھی ہے۔ حسن شاہ کی تادیب کے لیے پیر نے حکم دیا کہ دھوتی باندھو اور سر پر چوٹی رکھو' اور اسی حلیے میں پشاور تک پیدل جاؤ!

حسن شاہ اس کفارے کے بعد جس شان سے واپس آئے' اس کی سیر ہماری آپ کی آنکھوں نے بھی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی صورت میں کرلی۔

خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی فرماتے تھے کہ اللہ کا دوست وہی ہوسکتا ہے جس میں آفتاب کی سی شفقت' دریا کی سی سخاوت اور زمین جیسی تواضع ہو۔ سورج اپنے پرائے سب کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ دریا سے سب کی پیاس بجھتی ہے' اور زمین ماں کی گود کی طرح اپنے فرزندوں کے لیے بچھی رہتی ہے۔

تصوف کا یہ راستہ خدا کو اس کو بندوں کی راہ سے' اور خدا کے بندوں کو خدا کی راہ سے جاننے کا راستہ ہے۔ محبت کی روشنی کے بغیر اس راہ میں ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہے۔ یہاں تو دوستی کے سہارے ہی چل سکتے

ہیں۔ یہ عجیب راستہ ہے اور عجیب تر اس کے راہ رو۔ یہاں جو ہوش والے ہیں، وہ تو ہوش والے ہیں ہی۔ دیوانوں کا بھی وہ رنگ ہے، جس کا ایک قصہ فوائد الفواد میں نقل ہوا ہے کہ ایک مولوی صاحب کسی مجذوب کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ منزل پر اترے تو مجذوب تو اول شام سے چادر تان کر سوگیا۔ مولوی صاحب نے نماز کی تیاری کی۔ پڑوس کے تالاب پر وضو کرنے پہنچے تو دیکھا کہ کچھ عورتیں مٹکے لیے کھڑی ہیں، مگر پانی بھرنے آگے نہیں بڑھتیں۔ مولوی صاحب نے پوچھا: کس کا انتظار ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ تالاب کا چوکیدار بہت ظالم ہے۔ پانی میں پیر نہیں ڈالنے دیتا اور گہرے پانی میں جائے بغیر ہم مٹکے نہیں بھرسکتے، اس لیے اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا، چوکیدار بکتا ہے۔ لاؤ گھڑے مجھے دو، میں بھرتا ہوں۔ دیکھوں کون روکنے آتا ہے! یہ کہہ کر عورتوں کے سب مٹکے بھر دیے۔ واپس آکر سوچا کہ اذان دے کر نماز پڑھوں تاکہ کوئی اور نمازی قریب ہو تو وہ بھی آکر شریک ہو جائے۔ جیسے ہی اذان کی آواز بلند ہوئی، مجذوب نے چادر منہ پر سے سرکائی اور بولا:

"میاں! کیا شور مچا رہے ہو! کام تو بس وہ تھا جو تم نے بیکس عورتوں کے مٹکے بھر کر دیا تھا۔"